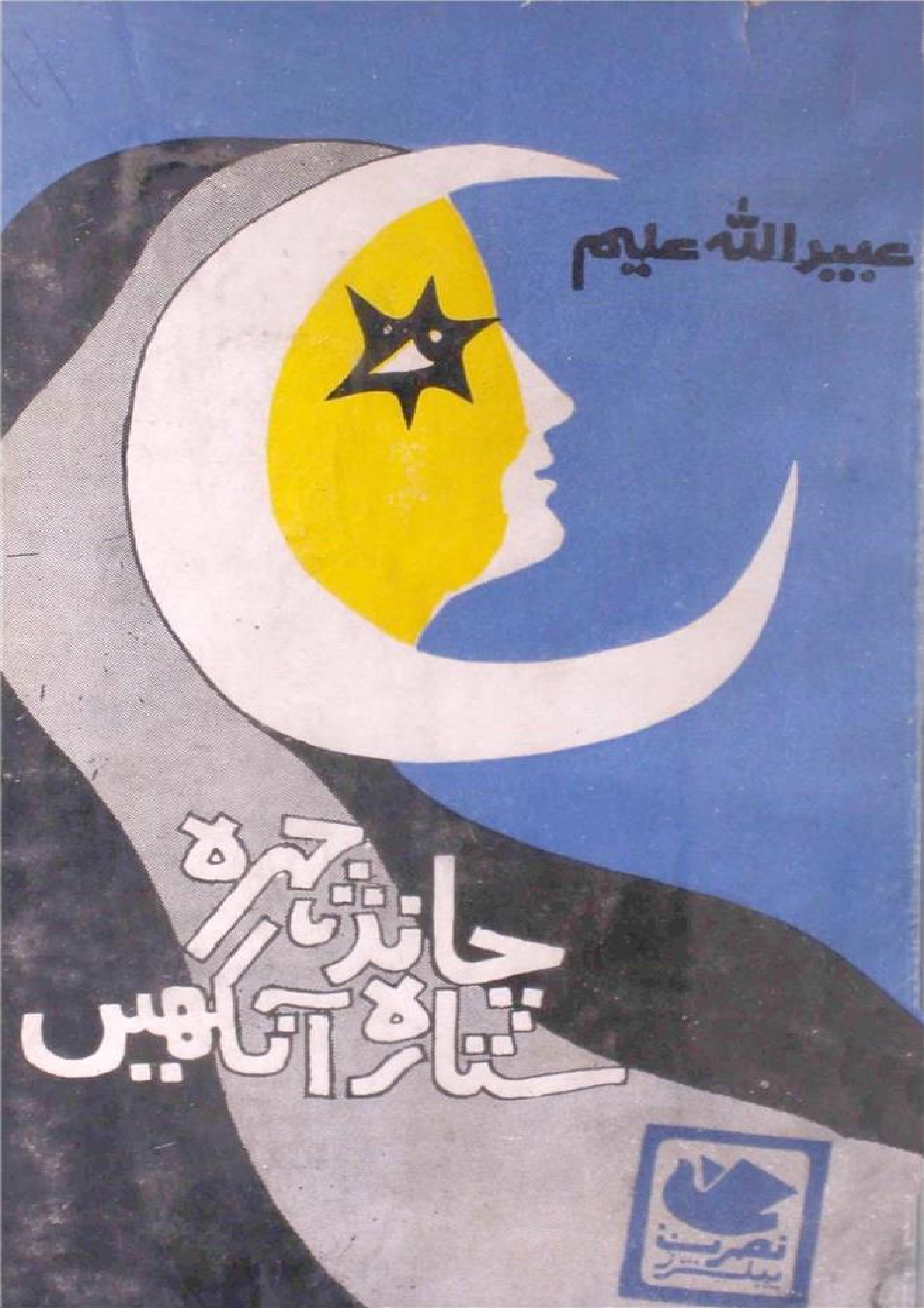

عبیداللہ علیم
چاند چہرہ
ستارہ آنکھیں
نصرت پبلشرز

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

عبداللہ علیم

نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ

نگار

کے نام

ترتیب : نسیم درّانی

سرورق : جمیل

کتابت : احسن رضوی

طابع : نظامی پریس۔ لکھنؤ

طباعت سرورق : ہندستان پریس۔ لکھنؤ

تعداد : چھ ۶ سو

قیمت : پچیس ۲۵ روپے

اشاعت : ۱۹۸۵ء

ناشر : نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

چہرہ

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

میرؔ

آئینہ

میرے آنگن میں گلاب کھل رہا ہے میں اس کا رنگ بتا سکتا ہوں مگر خوشبو کو صرف محسوس کر سکتا ہوں، بتا نہیں سکتا۔ مختلف تمثیلات و تشبیہات کے سہارے ممکن ہے آپ کو اپنے احساس میں شریک کر لوں مگر حقیقتاً خوشبو کی کیفیت اور ذائقے تک پہنچانا میرے بس میں نہیں۔

گلاب کس مٹی میں کھلتا ہے، اس کے لیے کون سا موسم اور فضا درکار ہے، اس پر بہت گفتگو ہو سکتی ہے مگر اس کی خوشبو کا تعین ممکن نہیں۔ شاعری کا بھی کچھ یہی احوال ہے۔ یہ بھی انسانی وجود کی ایک ایسی خوشبو ہے جسے بس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کی زندگی و ذات کے بارے میں اس کے

معاشرے اور کلچر کے بارے میں حساب لگایا جاسکتا ہے، مگر شعر کی کیفیت اور ذائقہ منتقل نہیں کیا جاسکتا اور نہ وہ محسوس کرایا جاسکتا ہے جو محسوس کیا جاتا ہے۔ محسوس کرانے کا عمل دراصل ایک دوسری تخلیق ہے جس کا پہلی تخلیق سے اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اس کے حوالے سے وجود میں آئی۔ کیا میں ان باتوں سے ابلاغ کی شرط اٹھا رہا ہوں قطعی نہیں صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ میں نے شعر کی صورت میں لکھا ہے میرا ابلاغ ہے اور آپ جس طرح اسے سمجھیں گے وہ آپ کا ابلاغ ہوگا۔ میں نے اپنی ذات کی اضافت سے لکھا آپ نے اپنی ذات کی اضافت سے محسوس کیا۔ بہت سے لوگ اس پر مجھ سے اُلجھنا چاہیں گے اور وہ بات کہیں گے جو کہی جاتی ہے مگر میں ہارنے کے تیار ہوں جھوٹ بولنے کے لیے تیار نہیں۔

تخلیق انکشافِ ذات ہے تو تنقید اُس انکشاف کی خبر ہے۔

تخلیق اپنے اندر ایک زبردست نمو کی طاقت رکھتی ہے اور خود بخود بڑھتی اور پھیلتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے اکیلا گلاب خوشبو کا ایک ہجوم اپنے ساتھ رکھتا ہے اور خوشبو فضاؤں میں گھلتی رہتی ہے آپ چاہیں تو اس کے شریک ہو جائیں لیکن خوشبو آپ کی محتاج نہیں۔ گلاب کی خوشبو آپ کی نیاز مند نہیں۔ مگر گلاب کا پودا فطرت کا اور آپ کا نیاز مند ہے

کہ اُسے اُگنے کے لیے زمین پانی اور روشنی بہر حال چاہئیں۔

شاعری میری دانست میں انسانی وجود کی خوش آہنگ اور مترنم بے اختیاری کا نام ہے۔ میں ابتک شاعری کے بارے میں اتنا ہی جان سکا ہوں۔ اپنی شاعری کے لیے بھی میرا یہی خیال ہے۔ شعر لکھنا میں نے کسی نظریے کے سہارے شروع نہیں کیا تھا اور اب تک کوئی نظریہ نہیں تراش پایا۔ ہر چند کہ یہ ہمارے شاعروں اور شاعری کی کچھ دن سے تعلقات ہے۔ بس میں ایک بات جانتا ہوں کہ میں شاعر ہوں۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شعر میری ذات کا ایسا اذیت ناک جبر ہے جس سے گزر کر مجھے خوشی ہوتی ہے یا میرے حواس کا وہ آئینہ ہے جو مجھے خود اپنے کو جاننے کی ایک عجیب سی لذّت اور سرشاری سے گزارتا ہے۔ سب کچھ باہر ہے مگر وہ نہیں ہے جو میرے اندر آ کر ہو جاتا ہے جن پر آپ کو سراب کا گمان گزرتا ہے میں نے ان چشموں سے پانی پیا ہے جنہیں آپ فریب جانتے ہیں میں نے اُن میں منزلوں کے نشان دیکھے ہیں۔ یہاں کوئی عمل اور کوئی بات طے شدہ نہیں۔ انسانی نفس کو جاننے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ بس اپنا اپنا وہم ہے اور اپنی اپنی قیاس آرائیاں۔

ان کمبخت لفظوں پر بھروسہ نہ کیا جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ میں ان کی تسخیر کر رہا ہوں یہ میری تعمیر کر رہے ہیں، یہ میرے وفادار ہیں لیکن کبھی کبھی میں ان کا وفادار نہیں ہوتا

ان کی حقیقی صورت میں کوئی اور صورت دیکھنا چاہتا ہوں مگر
ان کا ظرف کشادہ ہے یہ مجھ سے سمجھوتہ کرتے ہیں اور میرے
نطق سے بولتے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی مجبوری ہے میری
ہے ان میں اور مجھ میں ایک دوستانہ جنگ بھی جاری ہے
ان کی خواہش ہے کہ میں ان کی طرح بولوں مگر میں انھیں اپنی طرح
بولنے پر مجبور کرتا رہتا ہوں۔ یہ میرے بچے ہیں میں انکی اولاد
ہوں مجھے دیکھنا ہے کہ یہ جب آپ کے پاس پہنچتے ہیں تو
کیا ہو جاتے ہیں۔

مجھے ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے
حرف لکھے اور جو حرف لکھتے ہیں۔ میرے آئینے میں وہ چہرے
ضرور بولیں گے جنھیں میں نے اپنا چہرہ سمجھ کر دیکھا ہے میں
ان کی تکریم و تعظیم میں محض اپنا چہرہ پیش کرسکتا ہوں۔ اور
یہ میری شاعری ہے۔

مرے خدا مجھے وہ تابِ نَے نوائی دے
میں چُپ رہوں بھی تو نغمہ مرا سُنائی دے

گدائے کوئے سخن اور تجھ سے کیا مانگے
یہی کہ مملکتِ شعر کی خدائی دے

نگاہِ دہر میں اہلِ کمال ہم بھی ہوں
جو لکھ رہے ہیں وہ دُنیا اگر دکھائی دے

چھلک نہ جاؤں کہیں میں وجُود سے اپنے
ہُنر دیا ہے تو پھر ظرفِ کبریائی دے

مجھے کمالِ سخن سے نوازنے والے
سماعتوں کو بھی اب ذوقِ آشنائی دے

نمو پذیر ہے یہ شعلۂ نوا تو اسے
ہر آنے والے زمانے کی پیشوائی دے

کوئی کرے تو کہاں تک کرے مسیحائی
کہ ایک زخم بھرے دوسرا دہائی دے

میں ایک سے کسی موسم میں رہ نہیں سکتا
کبھی وصال کبھی ہجر سے رہائی دے

جو ایک خواب کا نشّہ ہو کم تو آنکھوں کو
ہزار خواب دے اور جراتِ رسائی دے

۱۹۷۱ء

خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی

نہ شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا
یہ ہم پہ بیت رہی ہیں قیامتیں کیسی

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

عذاب جن کا تبسّم ثواب جن کی نگاہ
کھنچی ہوئی ہیں پسِ جاں یہ صورتیں کیسی

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

جو بے خبر کوئی گزرا تو یہ صدا دی ہے
میں سنگِ راہ ہوں مجھ پر عنایتیں کیسی

نہیں کہ حُسن ہی نیرنگیوں میں طاق نہیں
جنوں بھی کھیل رہا ہے سیاستیں کیسی

نہ صاحبانِ جنوں ہیں نہ اہلِ کشف و کمال
ہمارے عہد میں آئیں کثافتیں کیسی

جو ابر ہے سو وہ اب سنگ و خشت لاتا ہے
فضا یہ ہو تو دلوں کی نزاکتیں کیسی

یہ دورِ بے ہُنراں ہے بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی کرامتیں کیسی

۱۹۶۴ء

خورشید بکف کوئی کہاں ہے
سب اپنی ہی روشنیٔ جاں ہے

میں بھی تو ادھر ہی جا رہا ہوں
مجھ کو بھی تلاشِ رفتگاں ہے

پھر دیکھنا خوابِ عہدِ رفتہ
مِل لو ابھی وقت مہرباں ہے

سودا بھی کروں تو کیا کہ دُنیا
باہر سے سجی ہوئی دُکاں ہے

شعلے کو خبر ہی کیا نمو میں
اپنے ہی وجود کا زیاں ہے

ہر لحظہ بدل رہی ہے دُنیا
ہر پل کوئی خواب رائیگاں ہے

لیتا ہی نہیں کہیں پڑاؤ
یادوں کا عجیب کارواں ہے

مانا کہ جُدا نہیں ہیں ہم تم
پھر بھی کوئی فصل درمیاں ہے

اے ابرِ بہار تو برس بھی
پھر تازہ ہجومِ تشنگاں ہے

اے موجِ فنا گزر بھی سر سے
ہونے کا مجھے بہت گماں ہے

۱۹۶۵ء

محبّت

میں جسم و جاں کے تمام رشتوں سے چاہتا ہوں
نہیں سمجھتا کہ ایسا کیوں ہے
نہ خال و خد کا جمال اُس میں، نہ زندگی کا کمال کوئی
جو کوئی اس میں ہُنر بھی ہوگا
تو مجھ کو اس کی خبر نہیں ہے
نہ جانے پھر کیوں!
میں وقت کے دائروں سے باہر کسی تصور میں اُڑ رہا ہوں
خیال میں، خواب و خلوتِ ذات و جلوتِ بزم میں شب و روز
مرا لہو اپنی گردشوں میں اُسی کی تسبیح پڑھ رہا ہے
جو میری چاہت سے بے خبر ہے

کبھی کبھی وہ نظر چُرا کر قریب سے میرے یوں بھی گزرا
کہ جیسے وہ باخبر ہے
میری محبتوں سے
دل و نظر کی حکایتیں سُن رکھی ہیں اُس نے
مری ہی صورت
وہ وقت کے دائروں سے باہر کسی تصور میں اُڑ رہا ہے
خیال میں، خواب و خلوتِ ذات و جلوتِ بزم میں شب و روز
وہ جسم و جاں کے تمام رشتوں سے چاہتا ہے
مگر نہیں جانتا یہ وہ بھی
کہ ایسا کیوں ہے
میں سوچتا ہوں، وہ سوچتا ہے
کبھی ملے ہم تو آئینوں کے تمام باطن عیاں کریں گے
حقیقتوں کا سفر کریں گے

۱۹۶۴ء

کوئی دھن ہو میں ترے گیت ہی گائے جاؤں
درد سینے میں اٹھے شور مچائے جاؤں

خواب بن کر تو برستا رہے شبنم شبنم
اور بس میں اسی موسم میں نہائے جاؤں

تیرے ہی رنگ اُترتے چلے جائیں مجھ میں
خود کو لکھوں تری تصویر بنائے جاؤں

جس کو ملنا نہیں پھر اس سے محبت کیسی
سوچتا جاؤں مگر دل میں بسائے جاؤں

تو اب اس کی ہوئی جس پہ مجھے پیار آتا ہے
زندگی آ تجھے سینے سے لگائے جاؤں

یہی چہرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے
ہر نئے حرف میں جاں اپنی سمائے جاؤں

جان تو چیز ہے کیا رشتۂ جاں سے آگے
کوئی آواز دیے جائے میں آئے جاؤں

شاید اس راہ پہ کچھ اور بھی راہیں آئیں
دھوپ میں چلتا رہوں سائے بچھائے جاؤں

اہلِ دل ہوں گے تو سمجھیں گے سخن کو میرے
بزم میں آ ہی گیا ہوں تو سنائے جاؤں

۱۹۷۲

یہ اور بات کہ اِس عہد کی نظر میں ہوں
ابھی میں کیا کہ ابھی منزلِ سفر میں ہوں

ابھی نظر نہیں ایسی کہ دور تک دیکھوں
ابھی خبر نہیں مجھ کو کہ کس اثر میں ہوں

پگھل رہے ہیں جہاں لوگ شعلۂ جاں سے
شریک میں بھی اسی محفلِ ہنر میں ہوں

جو چاہے سجدہ گزارے جو چاہے ٹھکرا دے
پڑا ہوا میں زمانے کی رہ گزر میں ہوں

جو سایہ ہو تو ڈروں اور دھوپ ہو تو جلوں
کہ ایک نخلِ نمو خاکِ نوحہ گر میں ہوں

کرن کرن کبھی خورشید بن کے نکلوں گا
ابھی چراغ کی صورت میں اپنے گھر میں ہوں

بکھر گئی ہے وہ خوشبو اُجڑ گیا ہے وہ رنگ
بس اب تو خواب سا کچھ اپنی چشمِ تر میں ہوں

قصیدہ خواں نہیں لوگو کہ عیش کر جاتا
دعا کہ تنگ بہت شاہ کے نگر میں ہوں

۱۹۶۶ء

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

ملے ہیں یوں تو بہت آؤ اب ملیں یوں بھی
کہ رُوح گرمیٔ انفاس سے پگھل جائے

محبتوں میں عجب ہے دِلوں کا دھڑکا سا
کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

زہے وہ دِل جو تمنائے تازہ تر میں رہے
خوشا وہ عمر جو خوابوں ہی میں بہل جائے

میں وہ چراغ سرِ رہ گزارِ دُنیا ہوں
جو اپنی ذات کی تنہائیوں میں ڈھل جائے

ہر ایک لحظہ یہی آرزو یہی حسرت
جو آگ دل میں ہے وہ شعر میں بھی ڈھل جائے

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں
یہ میرا چہرہ، یہ میری آنکھیں
بجھے ہوئے سے چراغ جیسے
جو پھر سے جلنے کے منتظر ہوں
وہ چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زلفیں
جنہوں نے پیماں کیے تھے مجھ سے
رفاقتوں کے، محبتوں کے
کہا تھا مجھ سے کہ اے مسافر رہِ وفا کے
جہاں بھی جائے گا ہم بھی آئیں گے ساتھ تیرے

بنیں گے راتوں میں چاندنی ہم تو دن میں سائے بکھیر دیں گے
وہ چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زلفیں
وہ اپنے پیماں رفاقتوں کے محبتوں کے
شکست کر کے
نہ جانے اب کس کی رہ گزر کا منارۂ روشنی ہوئے ہیں
مگر مسافر کو کیا خبر ہے
وہ چاند چہرہ تو بجھ گیا ہے
ستارہ آنکھیں تو سو گئی ہیں
وہ زلفیں بے سایہ ہو گئی ہیں
وہ روشنی اور وہ سائے مری عطا تھے
سو میری راہوں میں آج بھی ہیں
کہ میں مسافر رہِ وفا کا
وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زلفیں
ہزاروں چہروں ہزاروں آنکھوں
ہزاروں زلفوں کا ایک سیلابِ تُند لے کر
مرے تعاقب میں آ رہے ہیں
ہر ایک چہرہ ہے چاند چہرہ
ہیں ساری آنکھیں ستارہ آنکھیں
تمام ہیں
چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

مہرباں سایہ دار زلفیں
میں کس کو چاہوں، میں کس کو چُوموں
میں کس کے سائے میں بیٹھ جاؤں
بچوں کہ طوفاں میں ڈوب جاؤں
نہ میرا چہرہ، نہ میری آنکھیں
مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

۱۹۶۶ء

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص
ہُوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص

تمام رنگ مرے اور سارے خواب مرے
فسانہ تھے کہ فسانہ بنا گیا اک شخص

میں کس ہوا میں اُڑوں کس فضا میں لہراؤں
دکھوں کے جال ہر اک سُو بچھا گیا اِک شخص

پلٹ سکوں ہی نہ آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص

محبتیں بھی عجب اُس کی نفرتیں بھی کمال
مری ہی طرح کا مجھ میں سما گیا اک شخص

محبتوں نے کسی کی بھلا رکھا تھا اُسے
ملے وہ زخم کہ پھر یاد آگیا اِک شخص

وہ ماہتاب تھا مرہم بدست آیا تھا
مگر کچھ اور سوا دل دُکھا گیا اک شخص

کھُلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دُنیا
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص

۱۹۶۸ء

جوانی کیا ہوئی اِک رات کی کہانی ہوئی
بدن پُرانا ہوا روح بھی پرانی ہوئی

کوئی عزیز نہیں ماسوائے ذات ہمیں
اگر ہوا ہے تو یوں جیسے زندگانی ہوئی

نہ ہوگی خشک کہ شاید وہ لوٹ آئے پھر
یہ کِشت گزرے ہوئے اَبر کی نشانی ہوئی

تم اپنے رنگ نہاؤ میں اپنی موج اُڑوں
وہ بات بھول بھی جاؤ جو آنی جانی ہوئی

میں اُس کو بھول گیا ہوں وہ مجھ کو بھول گیا
تو پھر یہ دل پہ کیوں دستک سی ناگہانی ہوئی

کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے
بچھڑ گیا ہے تو یہ اُس کی مہربانی ہوئی

۱۹۶۹ء

اے دل شاید وہ خواب ہی تھا کب گھر کوئی میں نے بسایا تھا
کوئی رنگ تھا اور نہ خوشبو تھی سناٹا بولنے آیا تھا

اب تُو ہو کسی رنگ میں ظاہر تو مجھے کیا
ٹھہرے ترے گھر کوئی مسافر تو مجھے کیا

ویرانۂ جاں کی جو فضا تھی سو رہے گی
چہکے کسی گلشن میں وہ طائر تو مجھے کیا

وہ شمع مرے گھر میں تو بے نُور ہی ٹھہری
بازار میں وہ جنس ہو نادر تو مجھے کیا

وہ رنگ فشاں آنکھ وہ تصویر نما ہاتھ
دکھلائیں نئے روز مناظر تو مجھے کیا

میں نے اُسے چاہا تھا تو چاہا نہ گیا میں
چاہے مجھے اب وہ مری خاطر تو مجھے کیا

دُنیا نے تو جانا کہ نمو اس میں ہے میری
اب ہو وہ مری ذات کا منکر تو مجھے کیا

اِک خواب تھا اور بُجھ گیا آنکھوں ہی میں اپنی
اب کوئی پکارے مرے شاعر تو مجھے کیا

۱۹۶۹ء

الفاظ

یہ لفظ سقراط، لفظ عیسیٰ
میں ان کا خالق، یہ میرے خالق
یہی ازل ہیں، یہی ابد ہیں، یہی زماں ہیں یہی مکاں ہیں
یہ ذہن تا ذہن رہ گزر ہیں یہ رُوح تا رُوح اِک سفر ہیں
صداقتِ عصر بھی یہی ہیں کراہتِ جبر بھی یہی ہیں
علامتِ درد بھی یہی ہیں کرامتِ صبر بھی یہی ہیں
بغیر تفریقِ رنگ و مذہب زمیں زمیں ان کی بادشاہی
کھنچے ہوئے ہیں لہو لہو میں بچھے ہوئے ہیں زباں زباں پر
یہ جھوٹ بھی ہیں یہ لوٹ بھی ہیں یہ جنگ بھی ہیں یہ خون بھی ہیں
مگر یہ مجبوریاں ہیں ان کی

بغیر ان کے حیات ساری تو ہماتی
ہر ایک حرکت سکوت ٹھہرے
نہ کہہ سکیں کچھ، نہ سُن سکیں کچھ
ہر ایک آئینہ اپنی عکاسیوں پہ حیراں ہو اور چُپ ہو
نگاہِ نظارہ میں تماشا ہو وحشتوں کا
اجازتِ جلوہ دے کے جیسے زباں سے گویائی چھین لی جائے
نہ حُسن کچھ ہو، نہ عشق کچھ ہو
تمام احساس کی ہوائیں تمام عرفان کے جزیرے تمام یہ علم کے سمندر
سراب ہوں، وہم ہوں، گماں ہوں
یہ لفظ تیشہ ہیں جن سے افکار اپنی صورت تراشتے ہیں
مسیح دست و قلم سے نکلیں تو پھر یہ الفاظ بولتے ہیں
یہی مصوّر، یہی ہیں بُت گر، یہی ہیں شاعر
یہی مغنّی، یہی نوا ہیں
یہی پیمبر، یہی خدا ہیں
میں کیمیا ہوں، یہ کیمیا گر
یہ میرا کلیان چاہتے ہیں
میں ان کی تسخیر کر رہا ہوں
یہ میری تعمیر کر رہے ہیں

۱۹۶۵ء

میں جس میں کھو گیا ہوں مرا خواب ہی تو ہے
یک دو نفس نمود سہی زندگی تو ہے

جلتی ہے کتنی دیر ہواؤں میں میرے ساتھ
اک شمع پھر مرے لیے روشن ہوئی تو ہے

جس میں بھی ڈھل گئی اسے مہتاب کر گئی
میرے لہو میں ایسی بھی اک روشنی تو ہے

پرچھائیوں میں ڈوبتا دیکھوں بھی مہرِ عمر
اور پھر بچا نہ پاؤں یہ بیچارگی تو ہے

تو بوئے گل ہے اور پریشاں ہوا ہوں میں
دونوں میں ایک رشتۂ آوارگی تو ہے

اے خواب خواب عمر گریزاں کی ساعتو
تم سن سکو تو بات مری گفتنی تو ہے

۱۹۶۶ء

ہم دیوانوں کی قسمت میں لکھے ہیں یاں قہر بہت
کوچہ کوچہ سنگ بہت اور زنداں زنداں زہر بہت

جب تک ہم مانوس نہیں تھے درد کی ماری دنیا سے
عارض عارض رنگ بہت تھے آنکھوں آنکھوں سحر بہت

ہم تو جہاں والوں کی خاطر جان سے گزرے جاتے ہیں
پھر یہ ستم کیا ہے کہ ہمیں پر تنگ ہوا ہے دہر بہت

اپنے دیس کے لوگوں کا کچھ حال عجب ہی دیکھا ہے
سوئیں تو طوفان بھی کم اور جاگ اٹھیں تو لہر بہت

رات آئی تو گھر گھر وحشی سایوں کی تقسیم ہوئی
دن نکلا تو جبر کی دھوپ میں جلتا ہے یہ شہر بہت

ساری عمر تماشا ٹھہری ہجر و وصال کی راہوں کا
جس سے ہم نے پیار کیا وہ نکلا ہے بے مہر بہت

۱۹۶۵

دل گزار و کہ جاں نثار کرو
دور صدیوں کا یہ غبار کرو

کوئی مذہب نہیں ہے خوشبو کا
عام یہ مژدۂ بہار کرو

زندگی ایک بار ملتی ہے
دوستو زندگی سے پیار کرو

زُلف کی چھاؤں ہو کہ دار کی دھوپ
زندگی ہو جہاں قرار کرو

جو ابھی قرض ہوں دل و جاں پر
ان شکستوں کا بھی شمار کرو

رات کہتی ہے سو رہو چپ چاپ
دل یہ کہتا ہے انتظار کرو

اور کیا ہے تمہارے پاس علیمؔ
تحفۂ شعر نذرِ یار کرو

۱۹۶۲

لہو لہو زنجیر

صفحۂ دہر پر کرب کی خونچکاں آیتیں ثبت ہیں
اور میں پڑھ رہا ہوں انھیں
میں پیمبر، نہ میں فلسفی اور نہ میں دیوتا
ان کی تعظیم کرتا ہوں جو زندگی کی امر روشنی کے لیے مر گئے
اور مر جائیں گے
میرے احساس کی آنکھ پتھرا چلی زندہ الفاظ کے درد میں
اس سے پہلے کہ سارا لہو کھینچ لے
مرگ آثار، سفاک، ظالم ہوا
اے خدا، اے خدا
آ مرے دکھ میں کچھ تو بھی حصہ بٹا

۱۹۶۵

کچھ ٹوٹتے خواب سجائے ہوئے کچھ چبھتی یادیں بسائے ہوئے
میں ریزہ ریزہ بکھر گیا کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

پابہ زنجیر سہی زمزمہ خواں ہیں ہم لوگ
محفلِ وقت تری روحِ رواں ہیں ہم لوگ

دوش پر بارِ شبِ غم لیے گل کے مانند
کون سمجھے کہ محبت کی زباں ہیں ہم لوگ

خوب پایا ہے صلہ تیری پرستاری کا
دیکھ اے صبحِ طرب آج کہاں ہیں ہم لوگ

اِک متاعِ دل و جاں پاس تھی سو ہار چکے
ہائے یہ وقت کہ اب خود پہ گراں ہیں ہم لوگ

نکہتِ گل کی طرح ناز سے چلنے والو
ہم بھی کہتے تھے کہ آسودۂ جاں ہیں ہم لوگ

کوئی بتلائے کہ کیسے یہ خبر عام کریں
ڈھونڈتی ہے جسے دنیا وہ نشاں ہیں ہم لوگ

قسمتِ شب زدگاں جاگ ہی جائے گی علیمؔ
جرسِ قافلۂ خوش خبراں ہیں ہم لوگ

۱۹۶۳ء

صاحبِ مہر و وفا ارض و سما کیوں چپ ہے
ہم پہ تو وقت کے پہرے ہیں خدا کیوں چپ ہے

بے سبب غم میں سلگنا مری عادت ہی سہی
سازِ خاموش ہے کیوں شعلہ نوا کیوں چپ ہے

پھول تو سہم گئے دستِ کرم سے دمِ صبح
گنگناتی ہوئی آوارہ صبا کیوں چپ ہے

ختم ہو گا نہ کبھی سلسلۂ اہلِ وفا
سوچ اے داورِ مقتل یہ فضا کیوں چپ ہے

مجھ پہ طاری ہے رہِ عشق کی آسودہ تھکن
تجھ پہ کیا گزری مرے چاند بتا کیوں چپ ہے

جاننے والے تو سب جان گئے ہوں گے علیم
ایک مدت سے ترا ذہنِ رسا کیوں چپ ہے

۱۹۶۱

دُکھے دِلوں کو سلام میرا

دُکھے ہوئے دل ہیں میرا مذہب مرا عقیدہ
دُکھے ہوئے دل
مرا حرم ہیں، مرے کلیسا، مرے شوالے
دُکھے ہوئے دل
چراغ میرے، گلاب میرے
دُکھے ہوئے دل
کہ روشنی بھی ہیں اور خوشبو بھی زندگی کی،
دُکھے ہوئے دل
کہ زندگی کا عظیم سچ ہیں
دکھے ہوئے دل جہاں کہیں ہیں
دُکھے ہوئے دل مرا ہی دل ہیں
دُکھے دلوں کو سلام میرا

۱۹۶۷

ہر آواز مستانی ہے ہر جذبہ زندانی ہے
کوچۂ یار سے دار و رسن تک ایک سی ہی ویرانی ہے

کتنے کوہِ گراں کاٹے تب صبحِ طرب کی دید ہوئی
اور یہ صبحِ طرب بھی یارو کہتے ہیں بیگانی ہے

جتنے آگ کے دریا ہیں سب پار ہمیں کو کرنا ہیں
دُنیا کس کے ساتھ آئی ہے دنیا تو دیوانی ہے

لمحہ لمحہ خواب دکھائے اور سو سو تعبیر کرے
لذّت کم آزار بہت ہے جس کا نام جوانی ہے

دل کہتا ہے وہ کچھ بھی ہو اس کی یاد جگائے رکھ
عقل یہ کہتی ہے کہ توہم پر جینا نادانی ہے

تیرے پیار سے پہلے کب تھا دل میں ایسا سوز و گداز
تجھ سے پیار کیا تو ہم نے اپنی قیمت جانی ہے

آپ بھی کیسے شہر میں آکر شاعر کہلائے ہیں علیمؔ
دردِ جہاں کم یاب بہت ہے نغموں کی ارزانی ہے

۱۹۶۳ء

ایک ایسی بھی ہوا آئے گی
جو ہر اک زخم کو بھر جائے گی

یہ کنارے سے لپٹتی ہوئی موج
کبھی طوفاں بھی اُٹھا لائے گی

پھول میں ہو کہ ہوا میں خوشبو
نور ہے نور ہی برسائے گی

اور یہ عشق و ہوس کی دُنیا
تشنگی کے سِوا کیا پائے گی

پھول بھی شاخ سے گر جائینگے
شاخ بھی دھوپ سے مرجھائے گی

ہے سمٹتے ہوئے سائے کی صدا
اٹھ یہ دیوار بھی گر جائے گی

کوئی احساس اگر ہے تو کہو
بات لفظوں سے نہ بن پائے گی

۱۹۶۴ء

اب نہ اس سمت نظر جائے گی
جیسے گزرے گی گزر جائے گی

صورتِ زلف یہ تلوار سی رات
جیسے دل ہی میں اُتر جائے گی

ہم پہ اب جو بھی قیامت گزرے
تیری دُنیا تو سنور جائے گی

دُور تک ہم ہی نظر آئیں گے
جس طرف بھی وہ نظر جائے گی

اس بدلتی ہوئی رفتار کے ساتھ
زندگی جانے کدھر جائے گی

اور کچھ دن میں جنوں کی اپنے
شہر در شہر خبر جائے گی

لمحہ لمحہ جو سمیٹی ہے وہ عمر
ایک لمحے میں بکھر جائے گی

۱۹۶۴ء

گیت

نرم کونپل پہ شبنم کے موتی تال پر صبح کی گنگنائیں
ہونٹ پر جب کرن ہونٹ رکھ دے مسکرائیں تو واپس آئیں
نرم کونپل پہ شبنم کے موتی
سچے سر کی سچائی میں جھول رہے ہیں بدن
لہروں لہروں گاتی جائے جیسے مست پون
دیکھو ساون گاتا آیا
اپنے آنگن گاتا آیا
نرم کونپل پہ شبنم کے موتی
آؤ مل کے موج میں اپنی کھیلیں ہواؤں کے سنگ
ہولے ہولے بادل چھو لیں جیسے فضاؤں کے رنگ
دیکھو ساون گاتا آیا
اپنے آنگن گاتا آیا
نرم کونپل پہ شبنم کے موتی تال پر صبح کی گنگنائیں
ہونٹ پر جب کرن ہونٹ رکھ دے مسکرائیں تو واپس آئیں

۱۹۷۲ء

نیا عشق

اے میرے لہو کی لہرِ تازہ !
تو موسمِ ابر و باد و بادہ
چہرہ وہی خواب سا دکھا جا
باتیں وہ شراب سی سُنا جا
مِل کر نہ بچھڑ سکیں کبھی ہم
اک بار تو اِس طرح مِلا جا
جو میرے اور اُس کے درمیاں ہے
ڈھا جا وہ فصیلِ ہجر ڈھا جا
اے میرے لہو کی لہرِ تازہ!
تو موسمِ ابر و باد و بادہ

۱۹۶۵ء

موج کی جگہ لہر کے استعمال پر معذرت

کچھ دن تو بسو مری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

کوئی رنگ تو دو مرے چہرے کو
پھر زخم اگر مہکاؤ تو کیا

جب ہم ہی نہ مہکے پھر صاحب
تم بادِ صبا کہلاؤ تو کیا

اک آئینہ تھا سو ٹوٹ گیا
اب خود سے اگر شرماؤ تو کیا

تم آس بندھانے والے تھے
اب تم بھی ہمیں ٹھکراؤ تو کیا

دنیا بھی وہی اور تم بھی وہی
پھر تم سے آس لگاؤ تو کیا

میں تنہا تھا میں تنہا ہوں
تم آؤ تو کیا، نہ آؤ تو کیا

جب دیکھنے والا کوئی نہیں
بجھ جاؤ تو کیا، گہناؤ تو کیا

اک وہم ہے یہ دنیا اس میں
کچھ کھوؤ تو کیا، کچھ پاؤ تو کیا

ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں
جی جاؤ تو کیا، مر جاؤ تو کیا

۱۹۷۰ء

محبتوں کے یہ دریا اُتر نہ جائیں کہیں
جو دل گلاب ہیں زخموں سے بھر نہ جائیں کہیں

ابھی تو وعدہ و پیماں ہیں اور یہ حال اپنا
وصال ہو تو خوشی سے ہی مر نہ جائیں کہیں

یہ رنگ چہرے کے اور خواب اپنی آنکھوں کے
ہوا چلے کوئی ایسی بکھر نہ جائیں کہیں

جھلک رہا ہے جن آنکھوں سے اب وجود مرا
یہ آنکھیں ہائے یہ آنکھیں مکر نہ جائیں کہیں

پکارتی ہی نہ رہ جائے یہ زمیں پیاسی
برسنے والے یہ بادل گزر نہ جائیں کہیں

نڈھال اہلِ طرب ہیں کہ اہلِ گلشن کے
بجھے بجھے سے یہ چہرے سنور نہ جائیں کہیں

فضائے شہر عقیدوں کی دھند میں ہے اسیر
نکل کے گھر سے اب اہلِ نظر نہ جائیں کہیں

۱۹۷۰ء

کچھ تو بتاؤ شاعرِ بیدار کیا ہوا
کس کی تلاش ہے تمہیں اور کون کھو گیا

آنکھوں میں روشنی بھی ہے ویرانیاں بھی ہیں
اِک چاند ساتھ ساتھ ہے اک چاند گہہ گیا

تم ہم سفر ہوئے تو ہوئی زندگی عزیز
مجھ میں تو زندگی کا کوئی حوصلہ نہ تھا

تم ہی کہو کہ ہو بھی سکے گا مرا علاج
اگلی محبتوں کے مرے زخم آشنا

جھانکا ہے میں نے خلوتِ جاں میں نگارِ جاں
کوئی نہیں ہے کوئی نہیں ہے ترے سوا

وہ اور تھا کوئی جسے دیکھا ہے بزم میں
گر مجھ کو ڈھونڈنا ہے مری خلوتوں میں آ

اے میرے خواب آ مری آنکھوں کو رنگ دے
اے میری روشنی تو مجھے راستا دکھا

اب آ بھی جا کہ صبح سے پہلے ہی بجھ نہ جاؤں
اے میرے آفتاب بہت تیز ہے ہوا

یا رب عطا ہو زخم کوئی شعر آفریں
اک عمر ہو گئی کہ مرا دل نہیں دکھا

وہ دور آ گیا ہے کہ اب صاحبانِ درد
جو خواب دیکھتے ہیں وہی خواب نارسا

دامن بنے تو رنگ ہوا دسترس سے دور
موجِ ہوا ہوئے تو ہے خوشبو گریز پا

لکھیں بھی کیا کہ اب کوئی احوالِ دل نہیں
چیخیں بھی کیا کہ اب کوئی سُنتا نہیں صدا

آنکھوں میں کچھ نہیں ہے بجُز خاکِ رہ گزر
سینے میں کچھ نہیں ہے بجُز نالہ و نوا

پہچان لو ہمیں کہ تمہاری صدا ہیں ہم
سُن لو کہ پھر نہ آئیں گے ہم سے غزل سرا

۱۹۷۰ء

سچّا جھوٹ

میں بھی جھوٹا تم بھی جھوٹے
آؤ چلو تنہا ہو جائیں
کون مریض اور کون مسیحا
اس دکھ سے چھٹکارا پائیں
آنکھیں اپنی خواب بھی اپنے
اپنے خواب کسے دکھلائیں
اپنی اپنی روحوں میں سب
اپنے اپنے کوڑھ سجائیں
اپنے اپنے کاندھوں پہ سب
اپنی اپنی لاش اٹھائیں
بیٹھ کے اپنے اپنے گھر میں
اپنا اپنا جشن منائیں
شاید لمحۂ آئندہ میں
لوگ ہمیں سچا ٹھہرائیں

۱۹۶۶ء

عذاب آئے تھے ایسے کہ پھر نہ گھر سے گئے
وہ زندہ لوگ مرے گھر کے جیسے مر سے گئے

ہزار طرح کے صدمے اُٹھانے والے لوگ
نہ جانے کیا ہوا اک آن میں بکھر سے گئے

بچھڑنے والوں کا دکھ ہو تو سوچ لینا یہی
کہ اک نوائے پریشاں تھے رہ گزر سے گئے

ہزار راہ چلے پھر وہ رہ گزر آئی
کہ اک سفر میں رہے اور ہر سفر سے گئے

کبھی وہ جسم ہوا اور کبھی وہ روح تمام
اسی کے خواب تھے آنکھوں میں ہم جدھر سے گئے

یہ حال ہو گیا آخر تری محبت میں
کہ چاہتے ہیں تجھے اور تری خبر سے گئے

ہرا ہی رنگ تھے تو کیوں نہ بس رہے مجھ میں
مرا ہی خواب تھے تو کیوں مری نظر سے گئے

جو زخم زخم زباں بھی ہے اور نمو بھی ہے
تو پھر یہ وہم ہے کیسا کہ ہم ہنر سے گئے

۱۹۶۹ء

میں یہ کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
مرے شہر جل رہے ہیں مرے لوگ مر رہے ہیں

کوئی غنچہ ہو کہ گل ہو، کوئی شاخ ہو شجر ہو
وہ ہوائے گلستاں ہے کہ سبھی بکھر رہے ہیں

کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطۂ زمیں پر
وہی خطۂ زمیں ہے کہ عذاب اُتر رہے ہیں

وہی طائروں کے جُھرمٹ جو ہوا میں جھولتے تھے
وہ فضا کو دیکھتے ہیں تو اب آہ بھر رہے ہیں

بڑی آرزو تھی ہم کو نئے خواب دیکھنے کی
سو اب اپنی زندگی میں نئے خواب بھر رہے ہیں

کوئی اور تو نہیں ہے پسِ خنجر آزمائی
ہمیں قتل ہو رہے ہیں ہمیں قتل کر رہے ہیں

۱۹۷۱ء

خوشا وہ دَور کہ جب تجھ سے رسم و راہ نہ تھی
سکونِ کفر نہ تھا زندگی گناہ نہ تھی

نفس نفس پہ اُبھرتی ہوں سُولیاں جیسے
حیات اتنی تو پہلے کبھی تباہ نہ تھی

بہ فیضِ حسرتِ دیدار خسروانِ جنوں
اِدھر بھی دیکھ گئے جس طرف نگاہ نہ تھی

خود اپنی روشنیٔ طبع کے ستارے ہوئے
وہ ہم تھے دہر میں جن کو کہیں پناہ نہ تھی

وہ اِک نگاہ کہ سب کچھ سمجھ لیا تھا جسے
تباہیٔ دل و جاں پر وہی گواہ نہ تھی

۱۹۶۰ء

مرثیہ

اُداس یادوں کی مضمحل رات بیت بھی جا
کہ میری آنکھوں میں اب لہو ہے نہ خواب کوئی
میں سب دیے طاقِ آرزو کے بجھا چکا ہوں
تو ہی بتا اب
کہ مرگِ مہتاب و خونِ انجم پہ نذر کیا دوں
نہ میرا ماضی نہ میرا فردا
بکھر گئی تھی جو زُلف کب کی سنور چکی ہے
اور آنے والی سحر بھی آکر گزر چکی ہے
اُداس یادوں کی مضمحل رات بیت بھی جا!

۱۹۶۸ء

تین شعر

بُوٹا بُوٹا دھوپ جلا ہے شجر شجر بے سایا ہے
گھر اپنا صحرا تو نہیں ہے لیکن صحرا جیسا ہے

کچھ نہیں سیکھا ہم نے جنوں سے ہاں مگر اتنا سیکھا ہے
اُتنی اس کی عزت کی جو عشق میں جتنا رسوا ہے

ترکِ تعلق ایک قیامت پُرسشِ یاراں اور عذاب
کیا بتلائیں ہجر زدہ دل کیسے کیسے دُکھتا ہے

۱۹۶۶ء

لکھنے ہیں ابھی مرثیہ ہائے دل و جاں اور
کچھ زخم مجھے اے مرے مرہم نظراں اور

اتنا ہی کہ بس نغمہ سرایانِ جہاں ہیں
ملتا نہیں کچھ اِس کے سوا اپنا نشاں اور

کھینچے ہے مری طبع سخن اپنی ہی جانب
اور گردشِ دَوراں ہے کہ دکھلائے سماں اور

کچھ نذر ہوئے وقت کی بے رحم ہوا کے
کچھ خواب ابھی میرے لہو میں ہیں رواں اور

ہر لحظہ میں آزادیٔ جاں کا تھا طلب گار
ہر گام پڑی پاؤں میں زنجیر گراں اور

کس طرح سے اچھا ہو وہ بیمار کہ جس کو
دُکھ اور ہو، دیتے ہوں دوا چارہ گراں اور

۱۹۶۷ء

گزرو نہ اِس طرح کہ تماشا نہیں ہوں میں
سمجھو کہ اب ہوں اور دوبارہ نہیں ہوں میں

اک طبعِ رنگ رنگ تھی سو نذرِ گُل ہوئی
اب یہ کہ اپنے ساتھ بھی رہتا نہیں ہوں میں

ہو دیدۂ ہنر دلِ درد آشنا کی خیر!
کب لذّتِ خیال میں دریا نہیں ہوں میں

تم نے بھی میرے ساتھ اُٹھائے ہیں دُکھ بہت
خوش ہوں کہ راہِ شوق میں تنہا نہیں ہوں میں

پیچھے نہ بھاگ وقت کی اے ناشناس دُھوپ
سایوں کے درمیان ہوں سایا نہیں ہوں میں

جو کچھ بھی ہوں میں اپنی ہی صورت میں ہوں علیم
غالبؔ نہیں ہوں، میرؔ و یگانہ نہیں ہوں میں

۱۹۶۵ء

عشوہ و غمزہ و رم بھول گئے
تیری ہر بات کو ہم بھول گئے

لوگ دیتے ہیں جسے پیار کا نام
ایک دھوکا تھا کہ ہم بھول گئے

جن کو دعوئی تھا مسیحائی کا
اپنا ہی دیدۂ نم بھول گئے

یوں ہی الزام ہے دیوانوں پر
کب ہوئے تھے جو کرم بھول گئے

جانے کیوں لوگ ہنسا کرتے ہیں
جانے ہم کون سا غم بھول گئے

اب تو جینے دو زمانے والو
اب تو اس زلف کے خم بھول گئے

زندگی نے جو سکھایا تھا علیمؔ
زندگی کے لیے ہم بھول گئے

۱۹۶۱ء

دُکھے ہوئے ہیں ہمیں اور اب دکھاؤ مت
جو ہو گئے ہو فسانہ تو یاد آؤ مت

خیال و خواب میں پرچھائیاں سی ناچتی ہیں
اب اس طرح تو مری روح میں سماؤ مت

زمیں کے لوگ تو کیا دو دِلوں کی چاہت میں
خدا بھی ہو تو اُسے درمیان لاؤ مت

تمہارا سَر نہیں طفلانِ رہ گزر کے لیے
دیارِ سنگ میں گھر سے نکل کے جاؤ مت

سوائے اپنے کسی کے بھی ہو نہیں سکتے
ہم اور لوگ ہیں لوگو ہمیں ستاؤ مت

ہمارے عہد میں یہ رسمِ عاشقی ٹھہری
فقیر بن کے رہو اور صدا لگاؤ مت

وہی لکھو جو لہو کی زباں سے ملتا ہے
سخن کو پردۂ الفاظ میں چھپاؤ مت

سپرد کر ہی دیا آتشِ ہنر کے تو پھر
تمام خاک ہی ہو جاؤ کچھ بچاؤ مت

۱۹۶۵ء

وقت

کوہکن وقت تیشہ چلاتا ہوا صبح سے دوپہر تک تو آ ہی گیا
ہر قدم ڈھونڈتا اک نیا راستہ راہ شمس و قمر تک تو آ ہی گیا
صبح آغاز سے مہر رفتار ہے جو بھی ہے فرق وہ عمر کا فرق ہے
تیرگی روشنی کی گراں جنگ سے اب قوی اس کے سب مضمحل ہو چکے
ڈھل چکا نشۂ طاقت و عزم بھی آب تیشہ جو تھی سنگ نے چاٹ لی
ایک مزدور نے چاہ میں مزد کی جس طرح کٹ سکی زندگی کاٹ دی
اور آوارہ طائر کی مانند اب جھانکتا ہے پیاسی نظر سے کوئی
اس کو چشمہ ملے یا کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر اونگھ لے دو گھڑی
دور تک ہیں سرابوں ہی کے سلسلے پیڑ عنقا ہیں اور گرد کی چھاؤں ہے
کشتۂ خواب کو اجرت و مزد میں آس کا ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے
مہرباں کوئی قاصد سنا کے اسے مژدۂ مرگِ شیریں گزر جائے گا
اور یہ سنگِ منزل سے سر پھوڑ کر یا پھر اپنے ہی تیشے سے مر جائے گا

۱۹۶۰ء

شکستِ جاں سے سوا بھی ہے کارِ فن کیا کیا
عذاب کھینچ رہا ہے مرا بدن کیا کیا

نہ کوئی ہجر کا دن ہے نہ کوئی وصل کی رات
مگر وہ شخص کہ ہے جانِ انجمن کیا کیا

ادا ہوئی ہے کئی بار ترکِ عشق کی رسم
مگر ہے سر پہ وہی قرضِ جان و تن کیا کیا

نگاہِ بوالہوساں ہائے کیا قیامت ہے
بدل رہے ہیں گُل و لالہ پیرہن کیا کیا

گزر گئے تو گزرتے رہے بہت خورشید
جو رنگ لائے تو لائی ہے اک کرن کیا کیا

قریب تھا کہ میں کارِ جنوں سے باز آؤں
کھنچی خیال میں تصویرِ کوہ کن کیا کیا

۱۹۶۴ء

نمو

میں وہ شجر تھا
کہ میرے سائے میں بیٹھنے اور شاخوں پہ جھولنے کی ہزاروں جسموں کو آرزو تھی
زمیں کی آنکھیں درازئ عمر کی دعاؤں میں رو رہی تھیں
اور سورج کے ہاتھ تھکتے نہیں تھے مجھ کو سنوارنے میں
کہ میں اِک آواز کا سفر تھا
عجب شجر تھا
کہ اُس مسافر کا منتظر تھا
جو میرے سائے میں آ کے بیٹھے تو پھر نہ اُٹھّے
جو میری شاخوں پہ آ کے جھولے تو سارے موسم یہیں گزارے
مگر وہ پاگل ہوا کا جھونکا
عجب مسافر تھا رہ گزر کا

جو چھوڑ آیا تھا کتنے سائے
جو توڑ آیا تھا کتنی شاخیں
مگر لگا یوں کہ جیسے اب وہ شکستہ تر ہے
وہ میرے خوابوں کا ہم سفر ہے
سو میں نے سائے بچھا دیے تھے
تمام جھونکے ہلا دیے تھے
مگر وہ پاگل ہوا کا جھونکا، مگر وہ پاگل ہوا کا جھونکا
عجب مسافر تھا رہ گزر کا
کہ لمحے بھر میں گزر چکا تھا
میں بے نمو اور بے ثمر تھا
مگر میں آواز کا سفر تھا
سو میری آواز کا اجنبی تر تھا
عجب شجر تھا
عجب شجر ہوں
کہ آنے والے سے کہہ رہا ہوں
اے میرے دل میں اترنے والے
اے مجھ کو شاداب کرنے والے
تجھے مری روشنی مبارک
تجھے مری زندگی مبارک

ـلـہ میرا عجز سمجھ لیجیے

۱۹۶۹ء

نیند آنکھوں سے اُڑی پھول سے خوشبو کی طرح
جی بہل جائے گا شب سے ترے گیسو کی طرح

دوستو جشن مناؤ کہ بہار آئی ہے
پھول گرتے ہیں ہر اک آنکھ سے آنسو کی طرح

میری آشفتگیٔ شوق میں اِک حُسن بھی ہے
تیرے عارض پہ مچلتے ہوئے گیسو کی طرح

اب ترے ہجر میں لذّت، نہ ترے وصل میں لطف
ان دِنوں زیست ہے ٹھہرے ہوئے آنسو کی طرح

زندگی کی یہی قیمت ہے کہ ارزاں ہو جاؤ
نغمۂ درد لیے موجۂ خوشبو کی طرح

کس کو معلوم نہیں کون تھا وہ شخص علیم
جس کی خاطر رہے آوارہ ہم آہو کی طرح

۱۹۶۳ء

ایک نظارہ ہوں آنسو سے گہر ہونے تک
اِک تماشا ہوں میں شعلے سے شرر ہونے تک

تُو ہے وہ رنگ کہ آنکھوں سے نہ اوجھل ہو گا
میں ہوں وہ خواب کہ گزروں گا سحر ہونے تک

لکھنے ہیں پر یہ نہیں جانتے لکھنے والے
نغمہ اندوہِ سماعت ہے اثر ہونے تک

تُو کہیں بھی رہے زندہ ہے لہو میں میرے
میں سنواروں گا تجھے خاک بسر ہونے تک

ہائے وہ شمع جو اب دور کہیں جلتی ہے
میرے پہلو میں بھی پگھلی ہے سحر ہونے تک

۱۹۶۸ء

جو دیکھو تو کہاں ماتم نہیں ہے
مگر دُنیا کی رونق کم نہیں ہے

میں روتا ہوں کہ زخمِ آرزو کو
دعا دیتا ہوا موسم نہیں ہے

نئی آنکھیں نئے ہیں خواب میرے
مجھے یہ بھی سزا کچھ کم نہیں ہے

ہوں خود اپنی طبیعت سے پریشاں
مزاجِ دہر تو برہم نہیں ہے

ہوا کے دوش پہ جلتا دیا ہوں
جو بجھ جاؤں تو کوئی غم نہیں ہے

تو پھر میں کیا مری عرضِ ہنر کیا
صداقت ہی اگر پرچم نہیں ہے

مجھے کچھ زخم ایسے بھی ملے ہیں
کہ جن کا وقت بھی مرہم نہیں ہے

۱۹۶۵ء

پاؤ گے کہاں پناہ لوٹ آؤ
گھر ہو گیا ہے تباہ لوٹ آؤ

میری نہیں گر، تو اپنی خاطر
لوٹ آؤ دل و نگاہ لوٹ آؤ

تم چاہ میں جس کی مر رہے ہو
اس میں تو نہیں ہے چاہ لوٹ آؤ

تم جب سے گئے ہو چاند میرے
راتیں ہوئی ہیں سیاہ لوٹ آؤ

تم مل کے بچھڑ گئے ہو جس سے
تکتا ہے تمھاری راہ لوٹ آؤ

کیا ہو گئی زندگی تمھاری
اب اے مرے کج کُلاہ لوٹ آؤ

پھر بچھڑے ہوئے دِلوں کا مِلنا
ایسا بھی نہیں ہے گناہ لوٹ آؤ

۱۹۶۹ء

تیرا اندازِ سخن یاد آیا
اپنے چُپ رہنے کا فن یاد آیا

جس کی خوشبو سے معطّر تھا دماغ
پھر وہ شادابِ چمن یاد آیا

ہم جسے جیت کے بھی ہار گئے
پھر وہی وعدہ شکن یاد آیا

یاد آئے ہیں مسیحا اپنے
جب کوئی زخمِ کہن یاد آیا

موجِ خوں تھی کہ محبت اپنی
جب کبھی یاد آیا بدن یاد آیا

ہم کو جنّت بھی جہنم ہو گی
گر یہی رنج و محن یاد آیا

سوچتا ہوں کبھی اس کو بھی علیم
میری غزلیں مرا فن یاد آیا

۱۹۵۹ء

تھی جو محبتوں میں نزاکت نہیں رہی
کیا عشق کیجیے کہ روایت نہیں رہی

کہتے تھے ہم کہ جی نہ سکیں گے ترے بغیر
یہ کیا ہوا کہ تجھ سے محبت نہیں رہی

رسوائیوں سے بڑھ تو گیا زندگی کا بوجھ
پر یہ ہوا کہ خود سے ندامت نہیں رہی

کھنچتی تھی جس سے حرف میں اک صورتِ خیال
وہ خواب دیکھتی ہوئی وحشت نہیں رہی

اے موسمِ حیات و زمانہ کے شکوہ سنج
کیا صبر آ گیا کہ شکایت نہیں رہی

کیا نذر دیں جو کوئی نئی آرزو کریں
دل میں تو ٹوٹنے کی بھی ہمت نہیں رہی

جس سمت جائیے وہاں ملتے ہیں اپنے لوگ
اُس کی گلی ہی کوئے ملامت نہیں رہی

۱۹۷۲ء

آشنا اجنبی کے نام

کب تک آخر ہم سے اپنے دل کا بھید چھپاؤ گی
تمھیں راہ پہ اِک دن آنا ہے تم راہ پہ آ ہی جاؤ گی
کیوں چہرہ اُترا اُترا ہے کیوں بُجھی بُجھی سی ہیں آنکھیں
سُنو عشق تو ایک حقیقت ہے اسے کب تک تم جھٹلاؤ گی
سب رنگ تمھارے جانتا ہوں میں خوب تمھیں پہچانتا ہوں
کہو کب تک پاس نہ آؤ گی کہو کب تک آنکھ چُراؤ گی
بھلا کب تک ہم اِک دوسرے کو چھُپ چھُپ کر دیکھیں اور ترسیں
ہمیں یار ستائیں گے کب تک تم سکھیوں میں شرماؤ گی
یہ سرو تنی، محشر بدنی، گل پیرہنی، گوہر سخنی
سب حُسن تمھارا بے قیمت گر ہم سے داد نہ پاؤ گی

جب کھیل ہی کھیلا شعلوں کا پھر آؤ کوئی تدبیر کریں
ہم زخم کہاں تک کھائیں گے تم غم کب تک اپناؤ گی
چلو آؤ ابھی ہم تم مل بیٹھیں اور نئے سفر کا عہد کریں
ہم کب تک عمر گنوائیں گے تم کب تک بات بڑھاؤ گی
میں شاعر ہوں مرا شعر مجھے کسی تاج محل سے کم تو نہیں
میں شاہجہان شعر تو تم ممتاز محل کہلاؤ گی
نہیں پاس کیا گر عشق کا کچھ اور ڈریں نہ ظالم دنیا سے
شاعر پہ بھی الزام آئیں گے تم بھی رسوا ہو جاؤ گی

۱۹۶۴ء

تیرے پیار میں رسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ
جانے کیا کیا پوچھ رہے ہیں یہ جانے پہچانے لوگ

ہر لمحہ احساس کی صہبا روح میں ڈھلتی جاتی ہے
زیست کا نشہ کچھ کم ہو تو ہو آئیں میخانے لوگ

جیسے تمھیں ہم نے چاہا ہے کون بھلا یوں چاہے گا
مانا اور بہت آئیں گے تم سے پیار جتانے لوگ

یوں گلیوں بازاروں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں
جیسے اس دنیا میں سبھی آئے ہوں عمر گنوانے لوگ

آگے پیچھے دائیں بائیں سائے سے لہراتے ہیں
دُنیا بھی تو دشتِ بلا ہے ہم ہی نہیں دیوانے لوگ

کیسے دُکھوں کے موسم آئے کیسی آگ لگی یارو
اب صحراؤں سے لاتے ہیں پھولوں کے نذرانے لوگ

کل ماتم بے قیمت ہو گا آج ان کی توقیر کرو
دیکھو خونِ جگر سے کیا کیا لکھتے ہیں افسانے لوگ

۱۹۶۴ء

باعث ننگ نہیں صرفِ غمِ جاں ہونا
میری قیمت ہے ترے شہر میں ارزاں ہونا

یہ اندھیرے تو سمٹ جائینگے اک دن اے دوست
یاد آئے گا تجھے مجھ سے گریزاں ہونا

تم مجھے دیکھ کے اِس درجہ پریشاں مت ہو
میرے جی کا تو بہلنا ہے پریشاں ہونا

کیسے جیتے ہیں جنھیں طاقتِ اظہار نہیں
اپنے تو درد کا درماں ہے غزلخواں ہونا

مہرباں لوگ مرا نام جو چاہے رکھ لیں
ان کے منہ سے تو مجھے ننگ ہے انساں ہونا

نہ رہا شکوۂ بے مہریٔ ایام کہ اب
اپنی حالت پہ مجھے آ گیا حیراں ہونا

کوئی بتلائے یہ تکمیلِ وفا ہے کہ نہیں
اشک بن کر کسی مژگاں پہ نمایاں ہونا

اُس نے پوچھا ہے بڑے پیار سے کیسے ہو علیم
اے غمِ عشق ذرا اور فروزاں ہونا

۱۹۵۹ء

دوستو! خونِ شہیداں کا اثر تو دیکھو
کاسۂ سر لیے آئی ہے سحر تو دیکھو

درد کی دولتِ کمیاب مرے پاس بہت
ظرف کی داد تو دو، میرا جگر تو دیکھو

منزلِ شوق گریزاں ہے گریزاں ہی سہی
راہ گم کردہ مسافر کا سفر تو دیکھو

کون بے وجہ اُڑاتا ہے بہاروں کا مذاق
مجھ کو الزام نہ دو، اپنی نظر تو دیکھو

چاند کا دشت بھی آباد کبھی کر لینا
پہلے دُنیا کے یہ اُجڑے ہوئے گھر تو دیکھو

فخرِ ہم پیشگیٔ دیدہ وراں جانے دو
داغِ ہم پیشگیٔ ننگِ ہنر تو دیکھو

۱۹۶۱ء

خواب ہی خواب کب تلک دیکھوں
کاش تجھ کو بھی اک جھلک دیکھوں

چاندنی کا سماں تھا اور ہم تم
اب ستارے پلک پلک دیکھوں

جانے تو کس کا ہم سفر ہوگا
میں تجھے اپنی جاں تلک دیکھوں

بند کیوں ذات میں رہوں اپنی
سورج بن جاؤں اور چھلک دیکھوں

صبح میں دیر ہے تو پھر اک بار
شب کے رخسار سے ڈھلک دیکھوں

اُن کے قدموں تلے فلک اور میں
صرف پہنائی فلک دیکھوں

۱۹۷۲ء

ہنی مون

رات مہتاب اور صُبح گلاب
ڈھل رہے ہیں وہ جسم و جاں کے عذاب
چھو کے سب دیکھتا ہوں اپنے خواب
رات مہتاب اور صُبح گلاب

۱۹۷۰ء

کتھارسس

مجھے خبر ہے
تمہاری آنکھوں میں جو چُھپا ہے
تمہارے چہرے پہ جو لکھا ہے
لہو جو ہر آن بولتا ہے
مجھے بتا دو،
اور اپنے دُکھ سے نجات پالو

۱۹۷۳ء

وہ خواب خواب فضائے طرب نہیں آئی
عجیب ہی تھی وہ شب، پھر وہ شب نہیں آئی

جو جسم و جاں سے چلی جسم و جاں تلک پہنچی
وہ موجِ گرمیٔ رُخسار و لب نہیں آئی

تو پھر چراغ تھے ہم بے چراغ راتوں کے
پلٹ کے گزری ہوئی رات جب نہیں آئی

عجب تھے حرف کی لذّت میں جلنے والے لوگ
کہ خاک ہو گئے خوئے ادب نہیں آئی

جو ابر بن کے برستی ہے رُوحِ ویراں پر
بہت دنوں سے وہ آوازِ رب نہیں آئی

صدا لگائیں اور اپنا مذاق اُڑوائیں
یہ اہلِ درد پہ اُفتاد کب نہیں آئی

کیا ہے اپنے ہی قدموں نے پائمال بہت
یہ ہم میں کج کلہی بے سبب نہیں آئی

۱۹۷۲ء

وحشتیں کیسی ہیں خوابوں میں اُلجھا کیا ہے
ایک دُنیا ہے اکیلی تو ہی تنہا کیا ہے

داد دے ظرفِ سماعت تو کرم ہے ورنہ
تشنگی ہے مری آواز کی نغمہ کیا ہے

بولتا ہے کوئی ہر آن لہو میں میرے
پر دکھائی نہیں دیتا یہ تماشا کیا ہے

جس تمنّا میں گزرتی ہے جوانی میری
میں نے اب تک نہیں جانا وہ تمنّا کیا ہے

یہ مری روح کا احساس ہے آنکھیں کیا ہیں
یہ مری ذات کا آئینہ ہے چہرہ کیا ہے

کاش دیکھو کبھی ٹوٹے ہوئے آئینوں کو
دل شکستہ ہو تو پھر اپنا پرایا کیا ہے

زندگی کی اے کڑی دھوپ بچا لے مجھ کو
پیچھے پیچھے یہ مرے موت کا سایہ کیا ہے

۱۹۷۲ء

آؤ تم ہی کرو مسیحائی
اب بہلتی نہیں ہے تنہائی

تم گئے تھے تو ساتھ لے جاتے
اب یہ کس کام کی ہے بینائی

ہم کہ تھے لذتِ حیات میں گم
جاں سے اِک موجِ تشنگی آئی

ہم سفر خوش نہ ہو محبت سے
جانے ہم کس کے ہوں تمنائی

کوئی دیوانہ کہتا جاتا تھا
زندگی یہ نہیں مرے بھائی

اوّلِ عشق میں خبر بھی نہ تھی
عزتیں بخشتی ہے رسوائی

کیسے پاؤ مجھے جو تم دیکھو
سطحِ ساحل سے میری گہرائی

جن میں ہم کھیل کر جوان ہوئے
وہی گلیاں ہوئیں تماشائی

۱۹۷۲ء

آئیڈیل

میری آنکھوں میں کوئی چہرہ چراغِ آرزو
وہ میرا آئینہ جس سے خود چھلک جاؤں کبھی
ایسا موسم جیسے مے پی کر چھلک جاؤں کبھی
یا کوئی ہے خواب
جو دیکھا تھا لیکن پھر مجھے
یاد کرنے پر بھی یاد آیا نہ تھا
دل یہ کہتا ہے وہی ہے ہو بہو
جس کو دیکھا تھا کبھی اور سامنے پایا نہ تھا
گفتگو اُس سے ہے اور ہے رُوبرو
خواب ہو جائے نہ لیکن گفتگو
میری آنکھوں میں کوئی چہرہ چراغِ آرزو

۱۹۶۹ء

محسوس یہ ہوتا ہے کوئی ہر لمحہ خلوت و جلوت میں
ہے ساتھ مرے اور پوچھتا ہے اب حال تمھارا کیسا ہے

گیت

گھر کے چراغ روشن ہیں آج اہلِ محبت کے نام
کتنی حسین میری زمین میرے لہو کا سلام

میری وفا کا شعلہ جلتا رہے صبح و شام
میرے بدن کی مٹی آئے سدا تیرے کام
گھر کے چراغ روشن ہیں آج اہلِ محبت کے نام
میرا وطن ہے ایسا جیسے محبت کا نور
اس کی فضاؤں میں ہے موجِ بہاراں مسرور
گھر کے چراغ روشن ہیں آج اہلِ محبت کے نام
میرے خدا یا رکھیو میرے وطن میں بہار
میرے شہیدوں کا خوں ارضِ وطن کا نکھار
گھر کے چراغ روشن ہیں آج اہلِ محبت کے نام
کتنی حسین میری زمین میرے لہو کا سلام
گھر کے چراغ روشن ہیں آج اہلِ محبت کے نام

۱۹۷۱ء

تن جان سے اے ارضِ وطن مان گئے ہم
جب تو نے پکارا ترے قربان گئے ہم

جو دوست ہوا اُس پہ محبّت کی نظر کی
دشمن پہ ترے صورتِ طوفان گئے ہم

ہم ایسے وفادار و پرستار ہیں تیرے
جو تو نے کہا تیرا کہا مان گئے ہم

مرہم ہیں ترے ہونٹ مسیحا ہے تری زلف
ہم موجۂ گُل تھے کہ پریشان گئے ہم

افسوں کوئی چلنے نہ دیا حیلہ گراں کا
ہر شکل عدو کی ترے پہچان گئے ہم

خاکِ شہدا نے ترے پرچم کو دعا دی
لہرا کے جو پرچم نے کہا جان گئے ہم

۱۹۶۵ء

ابھی نہ کوئی پیمبر نہ ہیں کوئی اوتار
اے میری روشنیٔ طبع مجھ کو اور سنوار

نشاطِ رنج ہو، رنجِ نشاط ہو، کچھ ہو
حیات رقص ہے وحشت کا اور دائرہ وار

اسی کا نام محبت ہوا زمانے میں
وہ ایک نشہ کہ سکھا نہیں کہ جس نے اتار

میں اعترافِ شکستِ بہار کر لوں گا
ذرا اڑے تو سہی بوئے زلفِ عنبر بار

رہِ وفا میں چلو پھر سے اجنبی بن جائیں
کہ ڈھل رہا ہے پرانی محبتوں کا خمار

اس ایک قطرۂ خوں کا ہے نام شعرِ علیمؔ
جو دل میں ہو تو خزاں اور ٹپک پڑے تو بہار

۱۹۶۵ء

حادثہ گراں گزرا آپ سے تصادم کا
زندگی پہ ہوتا ہے اب گماں جہنم کا

روپ موسمِ گل نے اور خزاں نے ڈھالے ہیں
ایک میری آہوں کا اک ترے تبسم کا

لوگ اپنے دل کی بات ڈھونڈتے ہیں نغموں میں
شعر اک بہانہ ہے ساز کا ترنم کا

[illegible] آخر آ گئے ہیں دھوکے میں
اتنا دل نشیں لہجہ ہے ترے تکلم کا

تیری یاد تیرا غم اور شب کا سناٹا
زخمِ دل کی صورت ہے روپ ماہ و انجم کا

کیوں عتیق ہر لمحہ کھوئے کھوئے رہتے ہو
کس سے دل ہی دل میں ہے سلسلہ تکلم کا

۱۹۵۹ء

سہ بولا یوں بھی جاتا ہے

ساتھی سے

میں خود ہی اپنی بہار سے روٹھنے لگوں گر
تو تم مجھے روٹھنے نہ دینا
جو وار لمحے کا ہو وہ سہنا
یہ سوچ لینا
کہ ایک لمحہ گریز کا
کیسے
محبتوں کی اِک عمر پامال کر کے گزر رہا ہے

۱۹۶۹ء

اے مسیحا کہو کہ کب آخر
اپنے بیمار کے گھر آؤ گے

اب تک وہی خواب ہیں وہی میں
وہی میرے گلاب ہیں وہی میں

آنکھوں میں وہی ستارہ آنکھیں
وہی دل میں گلاب ہیں وہی میں

یہ جسم کہ جاں کی تشنگی ہے
وہی تازہ سراب ہیں وہی میں

زندہ ہوں ابھی تو مات کیسی
وہی جاں کے عذاب ہیں وہی میں

کہتی ہے زباں خموشیوں کی
وہی درد کے باب ہیں وہی میں

پڑھتے ہوئے جن کو عمر گزری
وہی چپ کی کتاب ہیں وہی میں

لکھتے ہوئے جن کو جان جائے
وہی حرف نصاب ہیں وہی میں

وہی رنجشیں اپنے دوستوں سے
وہی دل کے حساب ہیں وہی میں

آتے ہیں مگر نہیں برستے
وہی تشنہ سحاب ہیں وہی میں

دنیا کے سوال اور دنیا
وہی میرے جواب ہیں وہی میں

۱۹۷۳ء

میں زندہ ہوں

آخری رات تھی وہ
میں نے دل سے یہ کہا
حرف جو لکھتے گئے
اور جو زباں بولی گئی
سبھی بیکار گئے
میں بھی اب ہار گیا یار بھی سب ہار گئے
کوئی چارہ نہیں جز ترکِ تعلق اے دل
اِک صدا اور سہی آخری بار
جسم سے چھیڑ اُسے رُوح سے چھُو لے اُسے
آخری بار بجے سازِ بدن سے کوئی نغمہ کوئی لَے

آخری رات ہے یہ
آخری بار ہے یہ ذائقہ بوسہ و لمس
آخری بار چھلک جائے لہو
گرمیٔ جاں سے مہک جائے نفس کی خوشبو
خواب میں خواب کے مانند اُتر جائے دل
آخری رات تھی وہ
پھر گزر گوشۂ ندامت سے ہوا تو دیکھا
بام روشن ہے جو تھا
اور دروازے پہ دستک ہے وہی
جبرِ قاتل در و دیوار پہ کچھ نقش بناتا ہے ابھی
انگلیاں خون سے تر، دلِ کم ظرف کو ہے واہمۂ عرضِ ہنر
دن کی ہر بات ہوئی بے توقیر
رات ہے اور ضمیر
چشم ہے منتظرِ خوابِ دگر
خواب آتے ہیں ٹھہرتے ہیں چلے جاتے ہیں
اور قاتل کی سزا یہ بھی کہ میں زندہ ہوں

۱۹۶۰ء

سچ

میں بھی اِک جھوٹ ہوں
تم بھی اِک جھُوٹ ہو
اور سچ !
اپنے ہی درمیاں ہے
جسے
میں نہیں جانتا
تم نہیں جانتے

۱۹۶۶ء

سایۂ دیوار و در میں آ گئے
گھر کے سارے لوگ گھر میں آ گئے

مرتے تھے ہم جن گلابوں پر بہت
زخم کی صورت جگر میں آ گئے

آنکھ سے دُور سہی دل سے کہاں جائے گا
جانے والے تو ہمیں یاد بہت آئے گا

خواب سا دیکھا ہے تعبیر نہ جانے کیا ہو
زندگی بھر کوئی اب خواب ہی دہرائے گا

ٹوٹ جائیں نہ کہیں پیار کے نازک رشتے
وقت ظالم ہے ہر اک موڑ پہ ٹکرائے گا

عشق کو جرم سمجھتے ہیں زمانے والے
جو یہاں پیار کرے گا وہ سزا پائے گا

۱۹۶۴ء

جاگنے والوں کو کیا معلوم
اب کے سوئیں گے
تو کون سے خواب آئیں گے
اور کون سے سیلاب میں بہہ جائیں گے

دیوی

دُکھ سُکھ تجھے سُنانے والے
اپنی مُرادیں پانے والے
دِیے جلانے، پھول چڑھانے آنے والے
دیوی ہائے زمانے والے
اِن کی محبّت، ان کی عقیدت میں تُو انہی کو گَستی جا
زخم پہ مرہم رکھنے والی زخم پہ مرہم رکھتی جا
باہر باہر چُپ سادھے دکھ اندر اندر ہنستی جا
دُکھ کہنے والوں سے دُکھ سہنے والے لوگ بڑے ہوتے ہیں
جب تک چُپ ہیں ساتھ ہیں تیرے
جس دن بول اُٹھے گی اُس دن
تُو تنہا رہ جائے گی
اِن جیسی ہو جائے گی

۱۹۷۳ء

میں گہری نیند سونا چاہتا ہوں
بس اب خاموش ہونا چاہتا ہوں

جو بچھڑے ہیں کہ روٹھے ہیں میں ان سے
گلے مل مل کے رونا چاہتا ہوں

وجود اپنا اب مجھے دے دو

تمہارے ہیں کہو اک دن
کہو اک دن
کہ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے سب کچھ تمہارا ہے
کہو اک دن
جسے تم چاند سا کہتے ہو وہ چہرہ تمہارا ہے
ستارہ سی جنہیں کہتے ہو وہ آنکھیں تمہاری ہیں
جنہیں تم شاخ سی کہتے ہو وہ بانہیں تمہاری ہیں
کبوتر تولتے ہیں پر تو پروازیں تمہاری ہیں
جنہیں تم پھول سی کہتے ہو وہ باتیں تمہاری ہیں
قیامت سی جنہیں کہتے ہو رفتاریں تمہاری ہیں

کہو اک دن

کہو اک دن
کہ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے سب کچھ تمہارا ہے
اگر سب کچھ یہ میرا ہے تو سب کچھ بخش دو اک دن
وجود اپنا مجھے دے دو محبت بخش دو اک دن
مرے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ رکھ کر روح میری کھینچ لو اک دن

۱۹۷۳ء

نیلے رنگ کی چادر

آدمی خارش زدہ کُتّے کی طرح
اپنے پنجوں سے کھجاتا ہے زمیں کی کھال کو،
بھوک بھی لگتی نہیں اور شہوتیں بھی مر گئیں
کاش ایسا ہو کہ پھر سے
کوئی نیلے رنگ کی چادر زمیں پر پھینک دے

۱۹۷۲ء

کوئی ہوا ہو کوئی فضا ہو دیکھنے والی آنکھوں کے
اشک کہاں تھمنے پائے ہیں زخم کہاں بھرنے پائے

جب نہیں لکھیں تب بھی لکھیں جب نہیں سوچیں تب بھی سوچیں
ہم وہ لوگ تھے جو اِک پل آرام نہ کرنے پائے

پُوچھو تو بتلا نہ سکیں کیا بات تھی اُس میں ایسی
چاہیں تو سمجھا نہ سکیں جو رنگ نظر نے پائے

اس لمحے تو دھڑکن دھڑکن دل سے دُعا نکلتی ہے،
وقت تو گزرے لیکن یہ موسم نہ گزرنے پائے

(آہنگ میں لکھی گئی)

کاش ہم بچّے ہی رہتے

فلسفی بولے
زمیں کے ہاتھ میں اِک شاخ ہے زیتون کی
بجھ گئی تو بجھ گئی اور کِھل اٹھی تو کِھل اٹھی
ہم ہی مر جائیں گے اک دن وقت تو مرتا نہیں
کاش ہم بچّے ہی رہتے
اور کبھی نہ ٹوٹنے والے کھلونے کھیلتے

۱۹۷۲ء

ہنسو تو رنگ ہوں چہرے کا روؤ تو چشمِ نم میں ہوں
تم مجھ کو محسوس کرو تو ہر موسم میں ہوں

چاہا تھا جسے وہ مل بھی گیا پر خواب بھرے ہیں آنکھوں میں
اے میرے لہو کی لہر بتا اب کون سے میں عالم میں ہوں

لوگ محبت کرنے والے دیکھیں گے تصویر اپنی
ایک شعاعِ آوارہ ہوں آئینۂ شبنم میں ہوں

اُس لمحے تو گردشِ خوں نے میری یہ محسوس کیا
جیسے سر پہ زمیں اُٹھائے اک رقصِ مبہم میں ہوں

یار مرا زنجیریں پہنے آیا ہے بازاروں میں
میں کہ تماشا دیکھنے والے لوگوں کے ماتم میں ہوں

جو لکھے وہ خواب مرے اب آنکھوں آنکھوں زندہ ہیں
جو اب تک نہیں لکھ پایا میں اُن خوابوں کے غم میں ہوں

۱۹۷۳ء (آہنگ میں لکھی گئی)

اب تو فراقِ صبح میں بجھنے لگی حیات
بارِ الٰہ کتنے پہر رہ گئی ہے رات

ہر تیرگی میں تو نے اُتاری ہے روشنی
اب خود اُتر کے آ کہ سیہ تر ہے کائنات

کچھ آئینے سے رکھتے ہوئے ہیں مرے وجود
اور اِن میں اپنا جشن مناتی ہے میری ذات

بولے نہیں وہ حرف جو ایمان میں نہ تھے
لکھی نہیں وہ بات جو اپنی نہیں تھی بات

۱۹۷۳ء

بھیجتے رہیئے سلام بے نشاں پرچم کے نام

چاند سا دل ہو چاندنی سا گداز
ورنہ کیا نغمہ ساز و نغمہ نواز

سُننے والو اسے بھی سُن لینا
صُورتِ زخم بھی ہے اِک آواز

جس کو دیکھو وہ دل شکستہ ہے
کون ہے اِس جہاں کا آئینہ ساز

قید کی عمر ایسی راس آئی
سو رہی بازوؤں ہی میں پرواز

جس نے بخشے ہیں غم اُسی کے لیے
کر رہا ہوں دُعائے عمر دراز

۱۹۶۲ء

چند شعری مجموعے

اندروتم	نور الحسن ہاشمی	۱۵ روپے
لہو لمس چنار	حکیم منظور	۳۰ روپے
جاناں جاناں	احمد فراز	۲۰ روپے
شجر صدا	عمیق حنفی	۱۶ روپے
نژادِ سنگ	بلراج کومل	۱۶ روپے
سیلِ وجود	ساجدہ زیدی	۲۰ روپے
دوپہر	خورشید افسر بسوانی	۲۰ روپے
حادثوں کے درمیان	بشیر فاروقی	۱۸ روپے
لباسِ زخم	انجم عرفانی	۲۴ روپے
بھیگی زمین	احسن رضوی	۱۲ روپے
ریختۂ ولی	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۵ روپے
ریختۂ غالب	"	۵ روپے
دردِ تہہ جام	نازش پرتاپگڈھی	۲۰ روپے
نغمۂ سرمدی	"	۱۰ روپے
آتشِ سیال	ساجدہ زیدی	۱۲ روپے
غزل سانوری	بیکل اُتساہی	۳۰ روپے
مژگاں مژگاں	اطہر نبی	۲۰ روپے
ریزہ ریزہ حیات	وصیہ جائسی	۱۸ روپے
کلیاتِ اشعر ملیح آبادی	اسماء رفعت حسین	۳۰ روپے

نصرت پبلشرز - امین آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸